بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

پچھلی دو اشاعتوں سے ان صفحات میں اس خیال کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے کہ مسلمان دراصل ایک "جماعت" یا "پارٹی" کا نام ہے، اور اس کو مجرد ایک "قوم" سمجھ لینا غلطی ہے۔

یہ نئی آواز اکثر لوگوں کے لیے وجہ پریشانی بن گئی ہے۔ ان مضامین کو دیکھ کر متعدد اصحاب نے اپنے شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے۔ ایک صاحب نے تو بگڑ کر یہاں تک لکھ دیا کہ تم متضاد باتیں کر رہے ہو۔ آج تک تو تم مسلم قوم اور اسلامی قومیت کے تصور کی وکالت کر رہے تھے۔ اب خود اپنے ہی سابق دعوے کی نفی کرنے لگے۔ اب تم کہتے ہو کہ مسلمان قوم نہیں بلکہ پارٹی ہیں۔ کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ جس طرح ایک قوم میں مختلف سیاسی پارٹیاں ہوتی ہیں اور اپنا الگ مسلک رکھنے کے باوجود سب کی سب اُس بڑے مجموعہ میں شامل رہتی ہیں جس کو "قوم" کہا جاتا ہے، اسی طرح مسلمان بھی ایک پارٹی ہیں اور یہ ہندوستانی قوم کا ایک جزو بن کر رہ سکتے ہیں؟ اگر تمہارا یہی مطلب ہے تو آج تک تم ہندوستانی قوم پرستی کی مخالفت کس بنا پر کر رہے تھے؟

اسی قسم کے خیالات بعض دوسرے لوگوں نے بھی ظاہر کیے ہیں جن سے مجھے اندازہ ہوا کہ ابھی ہمارے عوام تو درکنار بہت سے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ بھی اُن باتوں کو سمجھنے کے لیے پوری طرح تیار نہیں ہیں جو آگے چل کر میں کہنا چاہتا ہوں۔ مدتوں سے جو خود فراموشی ان پر طاری ہے، اور غیر اسلامی حالات کی گیرائی نے جس طرح ان کو اپنے آپ سے اجنبی بنا دیا ہے اس کا طبعی اقتضا یہی ہے کہ خود شناسی (Self-realisation) کی طرف پہلا ہی قدم اٹھانے میں ان کو ذہنی الجھنیں پیش آئیں۔ لہٰذا بعد کے مباحث کو ملتوی کر کے سب سے پہلے میں ان الجھنوں کو صاف کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

جماعت یا پارٹی کے لفظ کو عام طور پر لوگ سیاسی جماعت یا پولٹیکل پارٹی کے معنی میں لیتے ہیں۔ اسی معنی سے وہ غلط فہمی پیدا ہوئی ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔ لیکن یہ اس لفظ کا اصلی مفہوم نہیں ہے بلکہ ایک خاص معنی میں بکثرت مستعمل ہونے سے پیدا ہو گیا ہے۔ اصلی مفہوم اس لفظ کا یہ ہے کہ جو لوگ ایک مخصوص عقیدے، نظریے، مسلک اور مقصد پر مجتمع ہوں وہ ایک جماعت ہیں۔ اسی معنی میں قرآن نے "حزب" اور "امت" کے الفاظ استعمال کیے ہیں، اور اسی معنی میں "جماعت" کا لفظ احادیث اور آثار میں مستعمل ہوا ہے، اور یہی مفہوم پارٹی کا بھی ہے۔

اب ایک جماعت تو وہ ہوتی ہے جس کے پیش نظر ایک قوم یا ملک کے مخصوص حالات کے لحاظ سے سیاسی تدبیر کا ایک خاص نظریہ اور پروگرام ہوتا ہے۔ اس قسم کی جماعت محض ایک سیاسی جماعت ہوتی ہے اس لیے وہ اس قوم کا جزو بنکر کام کر سکتی ہے اور کرتی ہے جس میں وہ پیدا ہو۔

دوسری جماعت وہ ہوتی ہے جو ایک کلّی نظریہ اور جہانی تصور (World theory) لیکر اٹھتی ہے۔ جس کے سامنے تمام نوع انسانی کے لیے (بلا لحاظ قوم و وطن) ایک عالمگیر مسلک ہوتا ہے۔ جو پوری زندگی کی تشکیل و تعمیر ایک نئے ڈھنگ پر کرنا چاہتی ہے۔ جس کا نظریہ و مسلک عقائد و افکار اور اصول اخلاق سے لیکر انفرادی برتاؤ اور اجتماعی نظام کی تفصیلات تک، ہر چیز کو اپنے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ جو ایک مستقل تہذیب اور ایک مخصوص تمدن (Civilization) کو وجود میں لانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ یہ جماعت بھی اگرچہ حقیقت میں ایک جماعت ہی ہوتی ہے، لیکن یہ اس قسم کی جماعت نہیں ہوتی جو کسی قوم کا جزو بن کر کام کر سکتی ہو۔ یہ محدود قومیتوں سے بالاتر ہوتی ہے۔ اس کا تو مشن ہی یہ ہوتا ہے کہ اُن نسلی و روایتی تعصبات کو توڑ دے جن پر دنیا میں مختلف قومیتیں بنی ہیں، پھر یہ خود اپنے آپ کو کس طرح ان قومیتوں کے ساتھ وابستہ کر سکتی ہے؟ یہ نسلی و تاریخی قومیتوں کے بجائے ایک عقلی قومیت (Intellectual

nationality) بناتی ہے - جامد قومیتوں کی جگہ ایک نامی قومیت (Expanding

nationality) بناتی ہے - یہ خود ایک ایسی قومیت بنتی ہے جو عقلی و تہذیبی وحدت کی بنیاد پر روئے زمین کی پوری آبادی کو اپنے دائرے میں لینے کے لیے تیار رہتی ہے - لیکن ایک قومیت بننے کے باوجود حقیقت میں یہ ایک جماعت ہی رہتی ہے، کیونکہ اس میں شامل ہونے کا مدار پیدائش پر نہیں ہوتا بلکہ اُس نظریہ و مسلک کی پیروی پر ہوتا ہے جسکی بنیاد پر یہ جماعت بنی ہے -

---

مسلمان دراصل اسی دوسری قسم کی جماعت کا نام ہے - یہ اُس قسم کی پارٹی نہیں ہے جیسی پارٹیاں ایک قوم میں بنا کرتی ہیں - بلکہ یہ اس قسم کی پارٹی ہے جو ایک مستقل نظام تہذیب و تمدن (Civilization) بنانے کے لیے اٹھتی ہے اور چھوٹی چھوٹی قومیتوں کی تنگ سرحدوں کو توڑ کر عقلی بنیادوں پر ایک بڑی جہانی قومیت بنانا چاہتی ہے - اس کو "قوم" کہنا اس لحاظ سے یقیناً درست ہوگا کہ یہ اپنے آپ کو دنیا کی نسلی یا تاریخی قومیتوں میں سے کسی قومیت کے ساتھ بھی باعتبار تمدن یا باعتبار جذبات وابستہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی بلکہ اپنے نظریہ حیات اور فلسفۂ اجتماع (Social philosophy) کے مطابق خود اپنی تہذیب و مدنیت کی عمارت الگ بناتی ہے - لیکن اس معنی کے لحاظ سے "قوم" ہونے کے باوجود یہ حقیقت میں "جماعت" ہی رہتی ہے کیونکہ محض اتفاقی پیدائش (Mere accident of birth) کسی شخص کو اس قوم کا ممبر نہیں بنا سکتی جب تک کہ وہ اس کے مسلک کا معتقد اور پیرو نہ ہو، اور اسی طرح کسی شخص کا کسی دوسری قوم میں پیدا ہونا اسکے لیے اس امر میں مانع بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی قوم سے نکل کر اس قوم میں داخل ہو جائے جب کہ وہ اسکے مسلک پر ایمان لانے کے لیے تیار ہو - پس جو کچھ میں نے کہا ہے اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ اس قوم کی قومیت اسکے ایک جماعت یا پارٹی ہونے ہی کی بنا پر قائم ہے جماعتی حیثیت جزء کا حکم رکھتی ہے اور قومی حیثیت اس کی فرع ہے - اگر جماعتی حیثیت کو اس سے الگ کر لیا جائے اور یہ مجرد ایک قوم بن کر رہ جائے تو یہ اس کا تنزل (Degeneration) ہے -

---

حقیقت یہ ہے کہ انسانی اجتماعات کی تاریخ میں اسلامی جماعت کی حیثیت بالکل نرالی (Unique) ہے۔ اسلام سے پہلے بودھ مت اور مسیحیت نے قومیتوں کے حدود کو توڑ کر تمام عالم انسانی کو خطاب کیا اور ایک نظریہ و مسلک کی بنیاد پر عالمگیر برادری بنانے کی کوشش کی۔ مگر ان دونوں مسلکوں کے پاس چند اخلاقی اصولوں کے سوا کوئی ایسا فلسفۂ اجتماع نہ تھا جس پر یہ تہذیب و تمدن کا کوئی کلی نظام بنا سکتے۔ اسلیے یہ دونوں مسلک کوئی عالمگیر قومیت نہ بنا سکے بلکہ ایک طرح کی برادری (Brotherhood) بنا کر رہ گئے۔ اسلام کے بعد مغربی تہذیب اٹھی جس نے اپنے خطاب کو بین الاقوامی بنانا چاہا، مگر اول یوم پیدائش سے اس پر نیشنلزم کا بھوت سوار ہو گیا لہٰذا یہ بھی عالمگیر قومیت بنانے میں ناکام ہوئی۔ اب مارکسی اشتراکیت آگے بڑھی ہے اور قومیتوں کی حدوں کو توڑ کر جہانی تصور کی بنیاد پر ایک ایسی تہذیب وجود میں لانا چاہتی ہے جو عالمگیر ہو۔ لیکن چونکہ ابھی تک وہ نئی تہذیب پوری طرح وجود میں نہیں آئی ہے جو اس کے پیش نظر ہے، اسلیے ابھی تک مارکسیت بھی ایک عالمگیر قومیت میں تبدیل نہیں ہو سکی ہے۔ اس وقت تک میدان میں تنہا اسلام ہی ایک ایسا نظریہ و مسلک ہے جو نسلی اور تاریخی قومیتوں کو توڑ کر تہذیبی بنیادوں پر ایک عالمگیر قومیت بناتا ہے۔ لہٰذا جو لوگ اسلام کی اسپرٹ سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں انکے لیے یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ایک ہی اجتماعی ہیئت کس طرح بیک وقت قوم بھی اور پارٹی بھی ہو سکتی ہے۔ وہ دنیا کی جتنی قوموں کو جانتے ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے جس کے ارکان پیدا نہ ہوتے ہوں بلکہ بنتے ہوں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ جو شخص اٹالین پیدا ہوا ہے وہ اٹالین قومیت کا رکن ہے اور جو اٹالین پیدا نہیں ہوا وہ کسی طرح اٹالین نہیں بن سکتا۔ ایسی کسی قومیت سے وہ واقف نہیں ہیں جس کے اندر آدمی اعتقاد اور مسلک کی بنا پر داخل ہوتا ہو اور اعتقاد و مسلک کے بدل جانے پر اس سے خارج ہو جاتا ہو۔ انکے نزدیک یہ صفت ایک قوم کی نہیں بلکہ ایک پارٹی کی ہو سکتی ہے۔ مگر جب وہ دیکھتے ہیں کہ یہ نرالی پارٹی اپنی الگ تہذیب بناتی ہے، اپنی مستقل قومیت کا ادعا کرتی ہے اور کسی جگہ بھی مقامی قومیت کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کرنے پر راضی نہیں ہوتی تو انکے لیے

یہ معاملہ ایک چیستاں بن کر رہ جاتا ہے۔

یہی نافہمی اب غیر مسلموں کی طرح مسلمانوں کو بھی پیش آ رہی ہے۔ مدتوں سے غیر اسلامی تعلیم و تربیت پاتے رہنے اور غیر اسلامی ماحول میں زندگی گذارنے کی وجہ سے انکے اندر تاریخی قومیت کا جاہلی تصور پیدا ہو گیا ہے۔ یہ اس بات کو بھول گئے ہیں کہ ہماری اصل حیثیت ایک ایسی جماعت کی تھی جو دنیا میں عالمگیر انقلاب برپا کرنے کے لیے وجود میں آئی تھی، جسکی زندگی کا مقصد اپنے نظریہ کو دنیا میں پھیلانا تھا، جس کا کام دنیا کے غلط اجتماعی نظامات کو توڑ پھوڑ کر اپنے فلسفۂ اجتماع کی بنیاد پر ایک عالمگیر اجتماعی نظام مرتب کرنا تھا۔ یہ سب کچھ بھول بھال کر انہوں نے اپنے آپ کو بس اسی قسم کی ایک قوم سمجھ لیا ہے جیسی اور بہت سی قومیں دنیا میں موجود ہیں۔ اب انکی مجلسوں اور انجمنوں میں، انکی کانفرنسوں اور جمعیتوں میں، انکے اخباروں اور رسالوں میں، کہیں بھی انکی اجتماعی زندگی کے اُس مشن کا ذکر نہیں آتا جسکے لیے ان کو دنیا بھر کی قوموں میں سے نکال کر ایک امت بنایا گیا تھا۔ اس مشن کے بجائے اب جو چیز انکی تمام توجہات کا مرکز بنی ہوئی ہے وہ "مسلمانوں کا مفاد" ہے ۔۔۔ مسلمانوں سے مراد وہ سب لوگ ہیں جو مسلمان ماں باپ کی نسل سے پیدا ہوئے ہوں، اور مفاد سے مراد ان نسلی مسلمانوں کا مادّی و سیاسی مفاد ہے یا بدرجۂ آخر اس کلچر کا تحفظ ہے جو ان کو آبائی ورثہ میں ملی ہے ۔۔۔ اس مفاد کی حفاظت اور ترقی کے لیے جو تدبیر بھی کارگر ہو اس کی طرف یہ دوڑ جاتے ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح مسولینی ہر اس طریقہ کو اختیار کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے جو اطالویوں کے مفاد کے لیے مناسب ہو۔ کسی اصول اور نظریہ کا نہ وہ پابند ہے نہ یہ۔ وہ کہتا ہے کہ جو کچھ اطالویوں کے لیے مفید ہو وہ حق ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ جو کچھ "مسلمانوں" کے لیے مفید ہو وہ حق ہے۔ یہی چیز ہے جس کو میں مسلمانوں کا تنزل کہتا ہوں، اور اسی تنزل کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے مجھے یہ یاد دلانے کی ضرورت پیش آئی ہے کہ تم نسلی اور تاریخی قوموں کی طرح ایک قوم نہیں ہو بلکہ حقیقت میں ایک جماعت ہو، اور تمہاری نجات صرف اس چیز میں ہے، کہ اپنے اندر جماعتی احساس (Party sense) بیدار کرو۔

اس جماعتی احساس کے فقدان یا خود فراموشی کے برے نتائج اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا شمار کرنا مشکل ہے یہ اسی بے حسی و خود فراموشی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان ہر جگہ مقتدی کی حیثیت سے نظر آرہا ہے۔ گاندھی، جواہر لال، بوس، رائے، ماتر، سیندر دیو، غرض جس نے بھی اپنا جھنڈا بلند کیا، کچھ نہ کچھ مسلمان اسکی طرف ضرور دوڑ گئے۔ گویا مسلمان کی حیثیت سے ان کا نہ کوئی اپنا مشن ہے، نہ کوئی نظریہ، نہ کوئی اصول، بلکہ یہ ہر مشن کی خدمت بجا لانے اور ہر نظریہ پر ایمان لانے کے لیے آزاد ہیں۔ انکے لیے کوئی منزل مقصود متعین نہیں۔ جو راہ رو جس منزل کی طرف بھی جا رہا ہو یہ اس کے پیچھے جا سکتے ہیں اور مسلمان کا لقب ان کا پیدائشی لقب ہے کہ اسلام کے مشن کو چھوڑ کر یہ خواہ کسی مشن کی خدمت کریں، یہ لقب بہرحال انکے ساتھ چپکا رہیگا۔

اسی خود فراموشی کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ جو ماس کانٹیکٹ مسلمانوں کو ہندوستان کی دوسری قوموں میں کرنا چاہیے تھا وہ دوسری قومیں خود مسلمانوں میں کرنے کے لیے آتی ہیں اور انکے ساتھ نئی روشنی کے جہلا ہی نہیں بلکہ ہمارے مدارس عربیہ کے محدث اور مفسر اور فقیہ بھی تشریف لاتے ہیں۔ اگر مسلمانوں کا جماعتی احساس مر نہ گیا ہوتا، اور انہیں یاد ہوتا کہ دنیا میں ہماری زندگی کا اصل مشن کیا ہے تو یہ خود اپنے فلسفۂ اجتماع کی بنیاد پر آزادی اور ترقی اور اجتماعی فلاح کا ایک پروگرام بناتے اور اس کو لیکر جمہور اہل ہند کے سامنے جاتے اور ان کو اپنے پروگرام کا حامی بنا کر سیاسی طاقت حاصل کرتے اور اس طاقت سے وہ حقیقی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کرتے جو اسلام چاہتا ہے کہ برپا کیا جائے۔ ہندوستان میں جو سیاسی اور معاشی ظلم ہو رہا ہے، یہاں کے باشندے جن تمدنی خرابیوں میں مبتلا ہیں، یہاں اخلاقی معاشرتی اور سیاسی جمہوریت کے فقدان سے جو برائیاں پیدا ہو رہی ہیں، ان کے علاج کی فکر و تدبیر کرنا دراصل مسلمان کا کام تھا۔ یہ دنیا میں پیدا ہی اسی لیے کیا گیا تھا کہ خدا کے بندوں کو ظلم اور گمراہی سے بچائے اور زمین پر عدل کی حکومت قائم کرے۔ اسی لیے اس کو قرآن دیا گیا تھا۔ اسی لیے اسے دنیا کے سب سے بڑے داعیٔ انقلاب محمد نبی علیہ السلام کی قیادت میں منظم کیا گیا تھا۔

مگر یہ اپنے آپ کو اور اپنے مشن کو اور قرآن و محمدؐ کی ہدایت کو پوری طرح فراموش کر چکا ہے - اب اجتماعی فلاح و ترقی کے پروگرام بنانا دوسروں کا کام ہے اور اس کا کام صرف یہ ہے کہ یا تو ان کے پروگرام کی تبلیغ کرتا پھرے مایا پھر یہ کہ ان کے فاتحانہ اقدامات کو دیکھ دیکھ کر ڈرے ، سہمے ، نوحہ کرے ، اور اپنا ماتمی مشن لیکر جگہ جگہ روتا پھرے -

---

اسی خود فراموشی کا نتیجہ آج ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان کے لیے تاریخ میں پہلی مرتبہ اقلیت اور اکثریت کا سوال پیدا ہوا ہے ، اور اُس کے لیے یہ بات سخت پریشانی کی موجب بن گئی ہے کہ سر شماری کے اعتبار سے جب میں چار کے مقابلہ میں ایک کی نسبت رکھتا ہوں تو اب میں جو گنتی تعداد کے غلبہ سے اپنے آپ کو کیسے بچاؤں۔ یہ پریشانی اب رفتہ رفتہ شکست خوردہ ذہنیت میں تبدیل ہو رہی ہے اور کمزور فریق کی طرح اب اس کو بچاؤ کی کوئی تدبیر اسکے سوا نہیں سوجھتی کہ پسپا ہو کر اپنے خول میں سمٹ آئے - اس صورت حال کی تنہا وجہ یہی ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو محض ایک قوم سمجھ رہا ہے جسکی قوت کا انحصار زیادہ تر تعداد پر ہوتا ہے - اگر اس کو یاد ہوتا کہ میں ایک جماعت ہوں اور وہ جماعت ہوں جس کا مشن ہی دنیا کو اپنے نظریہ و مسلک اور اپنے فلسفۂ اجتماع کی طاقت سے فتح کرنا ہے تو ہرگز اسے کوئی پریشانی پیش نہ آتی - اسکے لیے اکثریت و اقلیت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا - یہ اپنے خول میں سمٹ آنے کی فکر نہ کرتا بلکہ آگے بڑھ کر میدان جیتنے کی تدبیریں سوچتا۔ کثرت و قلت کا سوال صرف قوموں ہی کے لیے پیدا ہوتا ہے - جماعتوں کے لیے نہیں - جو جماعتیں کسی طاقتور نظریہ اور جاندار اجتماعی فلسفہ کو لے کر اٹھتی ہیں وہ ہمیشہ قلیل التعداد ہی ہوتی ہیں اور قلت تعداد کے باوجود بڑی بڑی اکثریتوں پر حکومت کرتی ہیں - روسی کمیونسٹ پارٹی کے ارکان کی تعداد اس وقت صرف ۲۳ لاکھ ہے اور انقلاب کے وقت [illegible] سے بہت کم تھی مگر اس نے ۷ کروڑ انسانوں کو مسخر کر لیا - مسولینی کی فاشسٹ پارٹی صرف ۴ لاکھ ارکان پر مشتمل ہے ، اور روم پر مارچ کرتے وقت ۳ لاکھ تھی ، مگر یہ قلیل تعداد

ساڑھے چار کروڑ اطالویوں پر حکمراں ہو گئی ۔ یہی حال جرمنی کی نازی پارٹی کا ہے ۔ اگر قدیم زمانے کی مثالیں خود اسلامی تاریخ سے دی جائیں تو ان کو یہ کہہ کر ٹالا جا سکتا ہے کہ وہ زمانہ گزر گیا اور وہ حالات بدل گئے ۔ لیکن یہ تازہ مثالیں آپ کے اسی زمانہ کی موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قلت آج بھی اُسی طرح حکمراں بن سکتی ہے بشرطیکہ وہ جہاد کے میدان میں اترے اور اپنے جماعتی مفاد کے لیے نہیں بلکہ عامۂ خلائق کی فلاح و نجات کے لیے سعی کرے، اور اپنے نظریہ و مسلک کو قولاً و عملاً اس طور پر پیش کرے کہ مصیبت زدہ عوام کی ہمدردیاں اس کو حاصل ہو جائیں ۔ اسلام کے اصول اس غرض کے لیے بہترین پروگرام دے سکتے ہیں اور اس پروگرام کو لے کر اگر مسلمان عملی مجاہدہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوں تو چند سال میں سیاست کا نقشہ بدل سکتا ہے ۔ لیکن یہاں مسلمانوں کی قیادت جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے وہ نہ اسلام کو جانتے ہیں، نہ اپنے آپ کو مسلمان کی حیثیت سے پہچانتے ہیں، نہ ان کو اس منبع کی خبر ہے جہاں اسلام کی قوت تسخیر چھپی ہوئی ہے ۔ ان کے دماغوں کی پہنچ زیادہ سے زیادہ جہاں تک ہو سکتی ہے وہ یہی ہے کہ یا تو اپنے آپ کو قلیل التعداد دیکھ کر محفوظ قلعوں کی طرف بھاگنے کی فکر کریں، یا اس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ ہمارے لیے دوسروں کے پیچھے چلنے اور اپنے آپ کو غیر مسلموں کی قیادت کے حوالہ کر دینے کے سوا کوئی زندگی نہیں ۔

دنیا میں اس وقت جتنی جماعتیں برسر اقتدار ہیں ان میں سے کسی جماعت کی تعداد بھی لاکھوں سے متجاوز نہیں ہے ۔ غالباً روسی کمیونسٹ پارٹی اس وقت سب سے بڑی جماعت ہے، مگر اس کے ارکان بھی ۳۲ لاکھ سے زیادہ نہیں ہیں ۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو کہنا پڑیگا کہ جس نظریہ و مسلک کے حامیوں کی تعداد صرف ایک ملک میں آٹھ کروڑ اور دنیا بھر میں ۴۰ کروڑ یا اس سے زیادہ ہو اس کو تمام کرۂ زمین پر حکمراں ہو جانا چاہیے ۔ یہ نتیجہ یقیناً رونما ہوتا اگر ان لوگوں میں جماعتی احساس بیدار ہوتا، اور انہیں اپنی جماعت کے مشن کا شعور نصیب ہوتا، اور یہ اس مشن کے لیے سعی و جہد پر کمربستہ ہوتے ۔ لیکن جس چیز نے اس عظیم الشان تعداد کو بالکل بے اثر ـــ قطعی ناکارہ بنا دیا ہے وہ اسی احساس و شعور اور اسی آمادگی

عمل کا فقدان ہے۔ مختلف قسم کی شیطانی قوتیں اس جماعت کو چمٹ گئی ہیں اور پیہم اس کوشش میں لگی ہوئی ہیں کہ کسی طرح یہ اپنے آپ سے واقف نہ ہونے پائے، اور اس کو کبھی اتنا ہوش ہی نہ آئے کہ یہ اپنی زندگی کے مشن کا خیال کر سکے۔

اگر آج کوئی شخص امریکہ میں یہ آواز اٹھائے کہ اب سے ۸۰ سال پہلے صدارت جمہوریہ کے منصب پر ابراہیم لنکن کا انتخاب بالکل ناجائز ہوا تھا، اور نیویارک کی سڑکوں پر "لنکن غاصب تھا" اور "لنکن مردود" کا شور مچاتا پھرے، اور لوگوں کو دعوت دے کہ لنکن کے خلاف ایجی ٹیشن کریں، تو یقین جانیے کہ امریکہ کی دس بارہ کروڑ آبادی بالاتفاق اس کو پاگل قرار دیگی اور اسکی اس صدا کا جواب بجز اسکے اور کچھ نہ ہوگا کہ اسے دماغی امراض کے ہسپتال میں بھیج دیا جائیگا۔ کوئی قوم جسکی عقل و دانش کا بالکل دیوالہ نہ نکل چکا ہو، اس حماقت کا ارتکاب نہیں کر سکتی کہ اپنی زندگی کے حقیقی مسائل کو چھوڑ کر ان مسائل پر لڑنے جھگڑنے میں اپنا وقت اور اپنی قوت ضائع کرے جنکا تصفیہ قرنوں پہلے واقعات کی دنیا میں ہو چکا ہو اور جن کے بارے میں آج کوئی مخالف یا موافق فیصلہ کرنے سے اسکی زندگی کے معاملات پر کسی قسم کا اچھا یا برا اثر نہ پڑ سکتا ہو۔

لیکن ذرا ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھیے۔ یہاں ایک مدت سے اس سوال پر جھگڑا اور سخت جھگڑا برپا ہے کہ اب سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے اسلامی حکومت کی صدر نشینی کے لیے ابوبکرؓ و عمرؓ کا جو انتخاب ہوا تھا وہ جائز تھا یا نہیں۔ ہندوستان کے ہر حصے سے سینکڑوں اور ہزاروں آدمی، جاہل نہیں بلکہ نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ، بڑی بڑی اونچی حیثیتیں رکھنے والے، وکیل اور بیرسٹر اور جج، کھنچ کھنچ کر لکھنؤ پہنچ رہے ہیں تاکہ اُس انتخاب کو جو ساتویں صدی عیسوی میں مدینہ میں ہوا تھا بیسویں صدی میں لکھنؤ کی سڑکوں پر باطل ٹھیرائیں! لاکھوں کروڑوں آدمی اس مسئلہ سے دلچسپی لے رہے ہیں۔ قوم کی ساری توجہات سمٹ کر اس مرکزی سوال پر جمع ہو گئی ہیں۔ وقت کے تمام مسائل اسکے سامنے پس پشت ڈال دیے گئے ہیں۔ دو بڑے گروہ پوری قوت کے ساتھ ایک دوسرے کے مقابلہ میں نبرد آزما ہیں تاکہ اس مسئلہ کا تصفیہ اپنے حق میں کرائیں۔ اور یہ سب کچھ ہو کس وقت رہا ہے؟ عین اس وقت جبکہ ہندوستان کی نئی قسمت بن رہی ہے اور واقعات کی دنیا میں اصلی تصفیہ طلب سوال یہ نہیں ہے کہ رسول اکرمؐ کے جانشین ابوبکرؓ ہوں یا علیؓ،

بلکہ یہ ہے کہ انگریز جس مسند حکومت کو خالی کر رہا ہے اس پر کون متمکن ہو؟

یہ صرف ایک مثال ہے ان لاطائل جھگڑوں کی جو شیاطین جن و انس نے صرف اس غرض کے لیے برپا کر رکھے ہیں کہ مسلمانوں کا ذہن مشغولیات میں الجھا رہے اور انہیں کبھی اُس مقصد کو پورا کرنے کی، بلکہ اس مقصد کو سمجھنے تک کی فرصت بھی میسر نہ آئے جس کے لیے اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا تھا اور "مسلم" کے نام سے ایک نئی امت بنائی تھی۔ آپ مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کا جائزہ لے لیجیے۔ ہر جگہ آپ کو یہی نظر آئیگا کہ ایک نہ ایک شیطان اس قوم کی جان کا لاگو بنا ہوا ہے اور پوری مستعدی کے ساتھ اپنے کام میں منہمک ہے۔ جہاں مسلمانوں میں مذہب کے ساتھ ابھی کچھ دلچسپی باقی ہے وہاں یہ شیاطین مذہبیت کا جامہ پہن کر آتے ہیں اور دین کے نام سے اُن مسائل پر بحثیں چھیڑتے اور نزاعیں برپا کرتے ہیں بلکہ بسا اوقات سر پھٹول اور مقدمہ بازیوں تک نوبت پہنچا دیتے ہیں جن کی دین میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اس طرح مسلمانوں کا سارا مذہبی جوش انکی اپنی تخریب میں ضائع ہو جاتا ہے۔ اور جہاں مذہب کی طرف سے کچھ سرد مہری پیدا ہو گئی ہے وہاں کچھ دوسری قسم کے شیاطین نمودار ہوتے ہیں، اور وہ دنیوی ترقی و خوشحالی کا سبز باغ دکھا کر مسلمانوں کو ایسی تحریکوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں جو اپنے مقاصد اور طریق کار کے لحاظ سے قطعاً غیر اسلامی ہیں۔

جن لوگوں کو مسلم عوام کی حالت دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس گئی گذری حالت میں بھی ان لوگوں کے اندر اچھی خاصی اخلاقی طاقت موجود ہے، جس سے بہت کچھ کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بہت سے روگ جو اس قوم کو لگے ہوئے ہیں، انہوں نے آٹھ نو کروڑ مسلمانوں کی اس عظیم الشان تعداد کو صفر کے درجے تک گرا دیا ہے۔ اسلام جس مقصد کے لیے جہاد اور محنت و جانفشانی چاہتا ہے، یہ اس سے بہت دور ہٹا دیئے گئے ہیں۔ ان کے ذہن سے اسلام کا صحیح تصور اور مسلمان کا حقیقی مفہوم نکال دیا گیا ہے۔ یہ درحقیقت خود اپنے آپ سے بیگانہ کر دیے گئے ہیں۔ جو اسلام ان کے

اندر پایا جاتا ہے اُس کے لیے کوئی مستقبل نہیں، کامیابی کا کوئی موقع نہیں۔

ان وجوہ سے وہ عظیم الشان تعداد جو ہم کو مردم شماری کے رجسٹروں میں نظر آتی ہے، اسلامی اغراض کے لیے قریب قریب بالکل بیکار ہو چکی ہے۔ اس تعداد کے بھروسہ پر اگر کچھ کیا جائیگا تو سخت مایوسی سے دوچار ہونا پڑیگا۔ ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ جو امید وابستہ کی جاسکتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اگر اسلام از سرِ نو ایک زندہ تحریک کی حیثیت سے اٹھے اور شیطانی قوتوں کے مقابلہ میں حکمرانی و فرمانروائی حاصل کرنے کے لیے برسر آمادہ ہو، تو شاید غیر مسلموں کی بہ نسبت ان مسلمانوں کا ایک معتدبہ حصہ زیادہ آسانی سے اور زیادہ جلدی اس تحریک کو قبول کریگا۔

اب جو لوگ حقیقت میں اُس اسلام کو جانتے اور سمجھتے ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا، اور جنکا قلب اس امر پر پوری طرح مطمئن ہے کہ انسانیت کی فلاح و سعادت اسی اسلام کی حکمرانی میں ہے اور صرف اسلام ہی کے اصول پر انسانی تمدن و اجتماع کا ایک معتدل و متوازن نظام تعمیر ہو سکتا ہے، اُن کو چند غلط فہمیاں سے اپنے ذہن کو صاف کر لینا چاہیے اور چند حقیقتیں اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہییں:

اوّل یہ کہ وہ مسلمانوں کے "مفاد" سے اسلام کا دامن باندھنا غلطی ہے۔ اسلام کی نگاہ میں یہ سوال ہرگز کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ ایک غیر اسلامی نظامِ حکومت کو چلانے کے لیے کتنے مسلمانوں کی خدمات فوج میں اور کتنوں کی پولیس میں، اور کتنوں کی دفتروں میں حاصل کی جاتی ہیں، اور کتنی نشستیں انکو مجالس قانون ساز میں ملتی ہیں تاکہ غیر اسلامی اصول پر قانون بنانے میں وہ بھی غیر مسلموں کے ساتھ حصہ دار ہوں اور کن ریاستوں کی مسند حکمرانی مسلمان فرمانرواؤں کے لیے محفوظ رکھی جائے تاکہ وہ غیر اسلامی طرز پر حکومت کرتے رہیں۔ اس قسم کے سوالات کو اسلامی سوالات کہنا اسلام کی توہین ہے، ایک اسلامی تحریک کو اس قسم کے تمام سوالات سے قطعاً بے تعلق ہونا چاہیے۔

دوسرے یہ کہ اسلام کی کامیابی نہ تو ان مسلمانوں کی تعداد اور طاقت پر منحصر ہے جو اس وقت مردم شماری میں مسلمان کی حیثیت سے لکھے ہوئے ہیں، اور نہ اسکی کامیابی کی راہ میں ہندوؤں اور دوسرے غیر مسلموں کی کثرت تعداد کوئی مضبوط رکاوٹ ہے مردم

شماری کے رجسٹروں میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کی آبادی کا تناسب دیکھ کر یہ گمان کرنا کہ اسلام کی طاقت ہندوستان میں صرف اتنی ہی ہے جتنا آبادی میں مسلمانوں کا تناسب ہے، اور یہ سمجھنا کہ آبادی میں غیر مسلموں کا تناسب جتنا زیادہ ہے اتنا ہی اسلام کی کامیابی کا امکان کم ہے، یہ صرف ان لوگوں کا کام ہے جو اسلام کو محض ایک جامد مذہبی رسم کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ اگر اسلام ایک زندہ عملی تحریک کی حیثیت سے میدان میں آجائے اور اسکے اصولوں کی بنیاد پر ہندوستانی زندگی کے حقیقی مسائل کو حل کرنیکے لیے ایک عملی پروگرام لے کر کوئی منظم جماعت اٹھ کھڑی ہو، تو یقین رکھیے کہ اس کا اپیل پیدائشی مسلمانوں تک محدود نہ رہیگا بلکہ شاید مسلمانوں سے بڑھ کر غیر مسلموں کو اپنی طرف کھینچے گا اور کوئی طاقت اس سیل رواں کو نہ روک سکیگی۔ آج جو لوگ اسلام کے تحفظ کی بس یہی ایک صورت دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو ہر طرف سے سمیٹ کر چند گوشہائے عافیت میں پہنچا دیا جائے، افسوس ہے کہ وہ اسلام کے ان امکانات سے ناواقف ہیں۔

تیسرے یہ کہ کسی تحریک کی کامیابی کا انحصار اس پر نہیں ہے کہ اس کے حقیقی معتقدوں اور پیرووں کی تعداد ملک میں ۶۰ یا ۷۰ فی صدی ہو جائے۔ تاریخ کے واقعات اور خود موجودہ دنیا کے تجربات ہمیں بتاتے ہیں کہ ایک مضبوط اور منظم پارٹی جس کے ارکان اپنی تحریک پر پورا ایمان رکھتے ہوں، اور اسکی راہ میں جان و مال قربان کرنے کیلیے تیار ہوں، اور پارٹی کے ڈسپلن کی کامل اطاعت کرتے ہوں، محض اپنے ایمان اور ڈسپلن کی طاقت سے برسراقتدار آسکتی ہے خواہ اسکے ارکان کی تعداد ملک کی آبادی میں ایک فی ہزار بھی نہ ہو۔ پارٹی کا پروگرام کروڑوں کو اپیل کرتا ہے، اور کروڑوں کی ہمدردی حاصل کرتا ہے۔ مگر خود پارٹی کے اندر صرف وہی لوگ ہوتے ہیں جو ایمان اور اطاعت امر کے اوصاف کمال درجے پر رکھتے ہوں۔ پس اسلام کو حکمراں بنانے کے لیے مسلمانوں کی کسی بہت بڑی تعداد کی ضرورت نہیں۔ تھوڑے ہی کافی ہیں بشرطیکہ علم اور عمل کے اعتبار سے حقیقی مسلمان ہوں اور خدا کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرنے پر مستعد ہوں۔